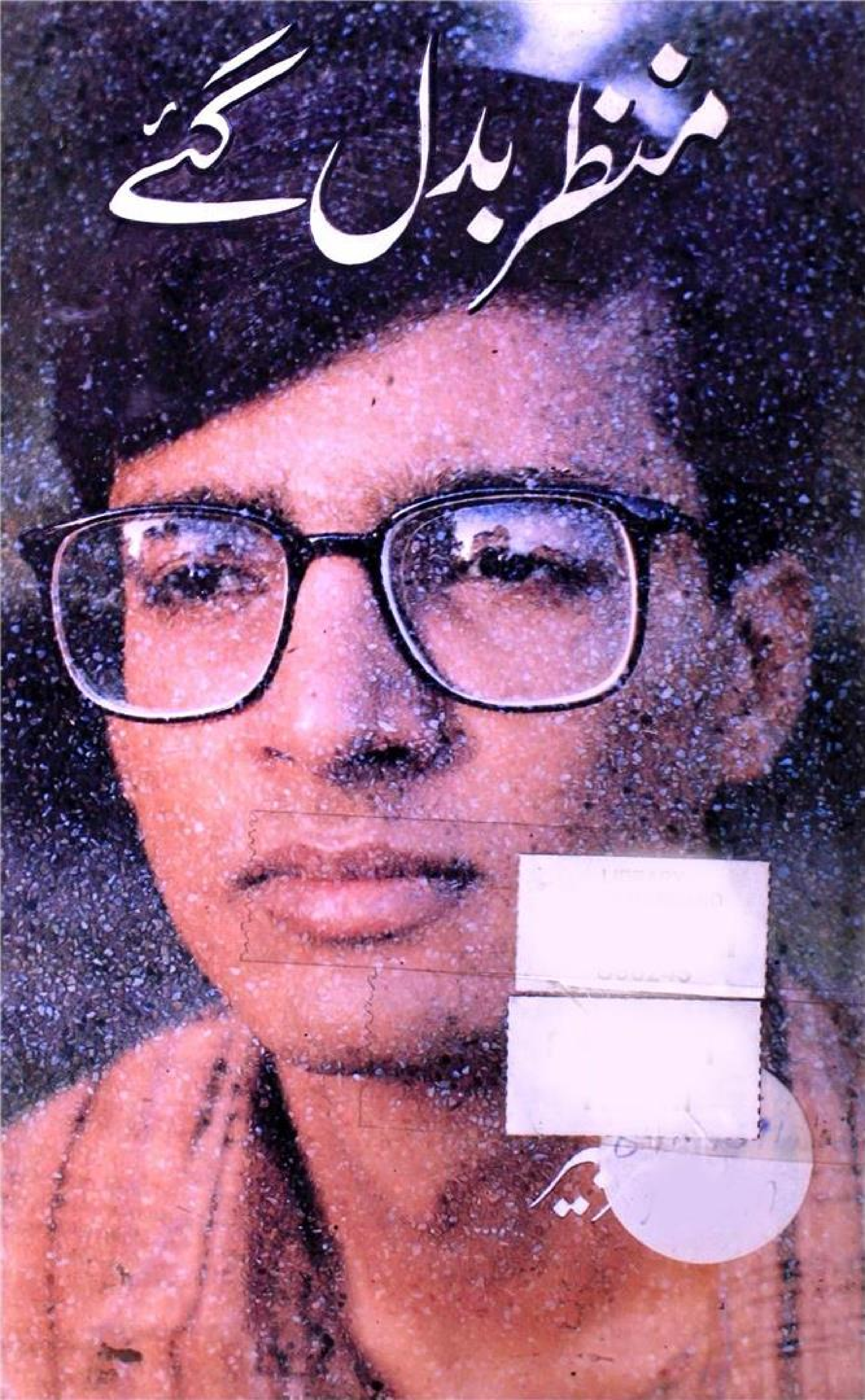
منظر بدل گئے



پہلی مٹی کی سولہ دسمبر اُداس ہے
لگتا ہے جیسے سارا کیلنڈر اُداس ہے

دیوار خستہ حال ہے اور دَر اُداس ہے
جب سے کوئی گیا ہے مِرا گھر اُداس ہے

اِک بار وہ مِلا تھا مجھے بے رُخی کے ساتھ
اُس دن سے دِل کا شہر برابر اُداس ہے

رنگینیوں میں کس نے بکھیری ہیں زردیاں
دیوار پر بنا ہوا منظر اُداس ہے

دیکھی ہے اُس کی آنکھ میں پہلی دفعہ نمی
یوں لگ رہا ہے جیسے سمندر اُداس ہے

ہم چھوڑ آئے نیند میں اپنی سماعتیں
واعظ اِسی لیے سرِ منبر اُداس ہے

یوں چاند چُپ کھڑا ہے سرِ دشتِ آسماں
جیسے زمیں پر کوئی بے گھر اُداس ہے

ملتان جا کے کوئی اُسے یہ پیام دے
لاہور میں تمہارا سخن ور اُداس ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منظر بدل گئے

منظر بدل گئے

ناصر بشیر

القمر انٹرپرائزز
رحمان مارکیٹ
اُردو بازار: لاہور

خوبصورت، معیاری کتابیں

القمر انٹرپرائزز
اہتمام: محمد سعید اللہ صدیقی

اشاعت	:	دوم
طبع	:	آر آر پرنٹرز' لاہور
قیمت	:	100 روپے

اِنتساب

کس کے نام کروں؟

منظر نامہ

دیباچہ

کالم نگاری کے بعد شاید سب سے زیادہ غیر ذمے دارانہ کام دیباچہ نویسی ہے، کالم نگار کی مشکل یہ ہے کہ اسے روز لکھنا ہوتا ہے اور اس کے پاس اتنا وقت ہوتا ہی کہاں ہے کہ وہ اپنے مواد کی تصدیق کر سکے، بلکہ اکثر اوقات تو اس کے پاس سوچنے کا وقت بھی نہیں ہوتا، آخر اسے کئی اور کام بھی تو کرنے ہوتے ہیں، فی زمانہ روٹی کمانا اور مشہور ہونا دونوں کام ہی مشکل سے مشکل تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کالم نگار کے لیے اس کا موضوع عام طور پر اتنا اہم نہیں ہوتا جتنا کہ کوئی ایسا فقرہ جو دوسروں کو چونکا دے۔ اُصولی طور پر ایسے فقرے دوسروں کی دل شکنی کے لیے لکھے جاتے ہیں، اگر کوئی شکایت کرے تو کالم نگار کہہ دیتا ہے "یار تم تو خواہ مخواہ ناراض ہو گئے یہ تو محض کالم تھا"

دیباچہ نویس کے لیے دُشواری یہ ہے کہ اسے ہمیشہ تعریف کرنی ہوتی ہے اور وہ کچھ بھی کر لے اس کا ممدوح کبھی مطمئن نہیں ہو پاتا۔ قاری البتہ ناراض ہو جاتا ہے کہ اسے تعریف کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، لہٰذا دیباچہ ایک فالتو شے ہو کر رہ گیا ہے، اس کی اب اتنی اہمیت بھی نہیں ہے جتنی کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کی ہوتی ہے، مگر اس کے باوجود مشکل ہی سے کوئی ایسی کتاب نظر آتی ہے جس پر دیباچہ موجود نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ دُنیا کا کوئی بڑے سے بڑا ادیب اور دانشور ایسا نہیں ہے جسے کبھی نہ کبھی دیباچہ نہ لکھنا پڑا ہو، مگر شاید ہی کوئی ایسا ادیب یا دانشور ہو جو اپنے لکھے ہوئے دیباچوں کے بارے میں سنجیدہ ہو، خواہ اس کے لکھے ہوئے دیباچے بعد میں جمع کر کے شائع ہی کیوں نہ کر دیے گئے ہوں۔

زندگی میں کچھ دیباچے لکھنے کی سعادت مجھے بھی حاصل ہوئی ہے مگر شاید ہی کبھی ایسا موقع آیا ہو کہ صاحبِ کتاب کو میرا لکھا ہوا دیباچہ جی سے پسند آ گیا ہو۔ ایک دو بار تو ایسا بھی ہُوا ہے کہ دیباچے کو باقاعدہ ایڈٹ کر کے شائع کیا گیا، اس میں سے چند جملے نکال لیے گئے۔

میں کوشش کرتا ہوں کہ تعریف اور تنقیص کے چکر میں نہ پڑوں، یہ بتانے کی کوشش کروں کہ شاعر کہنا کیا چاہتا ہے اور موجود صورت حال میں اس کے انفرادی مسائل کیا ہیں، اب بہت سے دوستوں کو یہ اندازہ ہو بھی گیا ہے، اس لیے جن لوگوں کو بہتر تقریظ کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجھ سے بہتر شخص تلاش کر لیتے ہیں۔

"منظر بدل گئے" ناصر بشیر کا پہلا شعری مجموعہ ہے، کسی بھی نوجوان کے کلام پر رائے زنی کرنا اس لیے خطرناک ہوتا ہے کہ خود اس کے بدل جانے کے امکانات بہت ہوتے ہیں لہٰذا اس کے بارے میں کوئی حتمی بات کہی نہیں جاسکتی۔ حتمی بات تو شاید کسی کے بارے میں بھی کہنا مشکل ہو، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شاعر کا مزاج اور موضوع متعین کرسکنا آسان ہوتا چلا جاتا ہے۔

غزل اپنے طور پر بھی ایسی صنفِ سخن نہیں ہے کہ جس میں اپنی راہ نکالنا آسان ہو، یہ کام تو بڑے بڑوں سے نہیں ہو پایا۔ غزل کا اپنا عمومی کلاسیکی مزاج ہے، اس کے بعد عصری رویے ہیں، فرد کا کام تو شاید اتنا ہی ہے کہ وہ ان رویّوں کی بنیاد پر اپنا ایک طرزِ احساس بنائے اور یوں INDIVIDUATION کی طرف پہلا قدم اُٹھائے۔ شاعر غزل نویسی کا آغاز انفرادیت کی تلاش سے کرتا ہے مگر اس کا مطمع نظر یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسی غزل لکھے جو پورے معاشرے کی نمائندہ ہو، لہٰذا یہ ایسا سانپ ہے جو اپنی دُم اپنے منہ میں لیے ہوئے ہے۔ اس کا آغاز ہی اس کا انجام ہے اور اس کا انجام ہی اس کا آغاز ہے۔

ناصر بشیر کے ہاں جو رویّے مجھے خاص طور پر اہم نظر آتے ہیں ان میں پہلا رویّہ تو تکمیل کاری (PERFECTIONISM) کا رویّہ ہے، جو ایسا شعر کہنا چاہتا ہے جس کی چاروں چولیں مضبوط ہوں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ عروضی ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ بحر کا آسان یا مشکل ہونا اس کے لیے مسئلہ نہیں ہے، لہٰذا یہ وہ میدان ہے جس میں بڑے بڑے تجربہ کار ٹھوکر کھا جاتے ہیں مگر ناصر بشیر وہاں سے آسانی سے گزر جاتا ہے۔

زبان و بیان میں اس نے تجربات کرنے کی کوشش کم کم کی ہے، جو کچھ موجود ہے اور جو کچھ اسے محسوس ہوا ہے، اس کو اس نے سہولت کے ساتھ لکھنے کو غنیمت جانا ہے، لہٰذا وہ اُستادانہ رویّہ جو اوزان کے سلسلے میں اختیار کیا گیا ہے اس کی تلافی زبان و بیان کی سادگی اور پُرکاری سے ہو جاتی ہے۔

ناصر بشیر نے بات کرنے کے لیے ایسے موضوعات بھی خاص طور پر تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی جو آج کل عام طور پر مشاعروں میں مقبول ہیں۔ لہذا اس کے ہاں وہ بچگانہ رومانوی رویّہ بھی نہیں ہے جسے بہت سے لوگ اپنی دستار کا پھول سمجھتے ہیں۔

ناصر بشیر کی غزل ایک سنجیدہ کاوش ہے اور میرے خیال میں یہی اس کا طرّۂ امتیاز ہے۔

اب آخر میں اس کے چند اشعار سن لیں :

جب تک مرے پر نکلیں مرے جسم سے باہر
ممکن ہے مِری خواہشِ پرواز ہی مر جائے

ہو کس لیے ستائشِ حُسن و جمالِ دوست
یہ کارِ بے ثواب کیا جائے کِس لیے

بڑی بڑی باتوں پر چُپ رہتے ہیں اور
ذرا سی بات پہ حیرت ہونے لگتی ہے

ہماری ذات کی تہ تک کوئی نہیں پہنچا
اب اپنے آپ پہ دیکھیں گے منکشف ہو کر

بچھڑتے وقت اس کی آنکھ میں آنسو نہیں تھے
اچانک مل گیا ہے راہ میں تو رو دیا ہے

مجھے ڈوبنا ہی تھا نیل میں
مِرے پاس کوئی عصا نہ تھا

یہ تو چند شعر تھے میری پسند کے، اب آپ اپنی پسند کے اشعار خود تلاش کریں۔

شہزاد احمد

"میں" سے "ہم" تک

باغ میں چاہے جتنے پھول کھلیں، دشت میں چاہے جتنے درخت اُگیں۔ آبادی کے بڑھنے کا مسئلہ نہ کوئی پھول اٹھاتا ہے نہ درخت۔ ہر پھول کی اپنی خوشبو ہوتی ہے ہر درخت کی اپنی اُٹھان۔ یہ تو ہم شعرا ہی ہیں کہ کسی نئے شاعر کی آمد پر سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ اب کیا بنے گا۔ اُس کے بعد سازشوں کا ایک نا مختتم سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یوں تو یہ کام ہر علاقے میں ہوتا ہے لیکن ملتان کی ڈھول دھرتی اس معاملے میں چار قدم آگے ہی ہو گی۔ ۱۹۸۱ء کی بات ہے، میں وہاں بسلسلہ تعلیم گیا ہوا تھا ایک مشاعرے میں شعر پڑھتے میں نے دیکھا کہ میرے اشعار پر شعراء ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ تو بہت بعد میں کھُلا کہ وہ معنی خیز نظریں کیا کہہ رہی ہیں اور میرے ہنر کی داد کون موصول کر رہا تھا۔ آپ خود سوچیں کہ ایسے ماحول میں جہاں کسی کے قصرِ سخن پر اپنے نام کی تختی لگانے کا رواج ہو وہاں نئے دیوانوں کی آمد پر کیا کیا ہنگامے نہ برپا ہوتے ہوں گے۔ ۱۹۸۱ء سے میں ملتان کی طرف دیکھ رہا ہوں، اوّل تو وہاں کسی بھی نوجوان شاعر کو دو چار غزلوں کے بعد ٹھس کر دیا جاتا ہے اور اگر کوئی کارِ ہنر سے باز نہ آئے تو اُس کو تلخ کر دیا جاتا ہے۔ میں جن دنوں کا ذکر کر رہا ہوں وہاں ایک نوجوان شاعر مصدق اقبال آیا۔ اُس کو مارنے کا ایک نیا طریقہ وضع کیا گیا۔ اُس نے اُردو اکیڈمی میں غزل برائے تنقید پیش کی تو ایک سینئر شاعر نے کہا "میں اس نوجوان شاعر سے غزل کہنا سیکھتا ہوں"۔ اُن صاحب نے نوجوان کی حوصلہ افزائی کے لیے یہ بات کہہ دی لیکن اس کے بعد مصدق اقبال کا نام مجھے کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ بہر حال ملتان کا عمومی مزاج وہی ہے کہ ہر اچھے نوجوان شاعر کی اُستادی کے دعویدار اُسے آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ بارہ تیرہ برس میں وہاں کے نوجوان لکھاری دوسرے شہروں کی نسبت بہت کم ہیں لیکن اُن میں بھی بزرگوں کے رویّے نے تلخی پیدا کر دی ہے۔ یہ تلخی شناخت کا مسئلہ بن کر سامنے آتی ہے انھیں بآوازِ بلند

کہنا پڑتا ہے کہ ہم شاعر ہیں ہمیں تسلیم کرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کے جتنے بھی نوجوان شعرا کو شناخت ملی ہے اُس کا اہتمام لاہور نے کیا ہے۔ انہی نوجوان شعرا میں ایک ناصر بشیر بھی ہے۔ یہ مضبوط ہڈی کا مالک ہے۔ ملتانی اساتذہ کی زد سے بچ نکلا ہے لیکن اس کے اندر جو مسائل وہاں کے بزرگ شعرا کے ردِّعمل میں جگہ بنا چکے ہیں وہ شاید اُس کی سائیکی کا حصّہ بن گئے ہیں۔ وہ تیزی، تلخی اور تسلیم نہ کیے جانے کا جو دُکھ اُسے ابتدا میں میسر آیا وہ اس کے ایک ایک مصرع سے جھلکتا ہے۔ ہر چند اُسے لاہور نے گلے لگایا ہے لیکن اِس کی وفا سے شاید تلافی نہ ہو سکے۔

میں نے ابھی جس تلخی کا ذکر کیا ہے یہ ناصر بشیر کی شاعری میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اور پہچان کا مسئلہ بن کر سامنے آتی ہے۔ یوں تو پہچان کا مسئلہ ہر دَور کے شعرائے کے ہاں ملتا ہے۔ غالب جیسا شاعر بھی اپنی ناقدری کا ماتم کرتا ہے۔ لیکن ہمارے عہد میں اس سوال نے شدّت اختیار کر لی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہر چہرہ پہچان گُم کر بیٹھا ہے۔ جنھیں پہچانا نہیں جاتا وہ چاہتے ہیں کہ دیکھنے والے کی آنکھیں بدل دی جائیں شاید اس طرح وہ پہچانے جائیں۔
ناصر بشیر نے توقع سے زیادہ اس مسئلے کو اپنی ذات سے باہر قومی تشخص کے مسئلہ تک پھیلایا ہے کیونکہ شاعر کتنا بھی تلخ کیوں نہ ہو آخری رائے کے مطابق وہ محبت کرنے والا ہی ہوتا ہے۔ اُس نے بھی اپنی ذاتی تلخی کو اجتماعیت دے دی ہے۔ لیکن کہیں کہیں محبت کے موضوع کا تڑکا لگا کے اپنی غزل کو دو آتشہ کر دیا ہے۔

صاحبو! یہ تھا وہ ماحول جس میں باہمت ناصر بشیر نے اپنے سخن کی نَو اُونچی کی۔ اُس نے کسی گریبان میں ہاتھ نہیں ڈالا۔ کوئی پگڑی نہیں اُچھالی کسی کو گالی نہیں دی۔ اُس نے ایسا محض اس لیے نہیں کیا کہ اُسے اپنے لفظ پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ جو اپنے ڈھب کے آدمی ہوا کرتے ہیں اُن میں ہی یہ تیقن اور اعتماد جھلکتا ہے۔ وہ چاہتا تو بلند بانگ دعوے کر سکتا تھا، اپنی زبانی میاں مٹھو بن سکتا تھا لیکن اُسے کیا ضرورت جس کے لفظ میں طاقتِ پرواز ہو۔ اس کے باوجود کہ وہ کمالِ ضبط رکھتا ہے لیکن اُس نے سفّاک زمانے کے رویّے پر منافقانہ چُپ نہیں سادھی بلکہ اپنے شعر کے ذریعے ایک پُر اثر احتجاج ریکارڈ کرایا ہے۔ وہ عُمر کے اس میٹھے برس میں بچّے کی طرح بلکتا نہیں بڑوں کی طرح باتیں کرتا ہے، کبھی کبھی تو اُس کے شعر سُن کر ذوق کا وہ فقرہ یاد آتا ہے جو انھوں نے ایک نوجوان کا مطلع سُن کر کہا تھا کہ "میاں صاحبزادے تم

بڑے، ہوتے نظر نہیں آتے،، خاکم بدہن میں نے یہ بات ناصر بشیر کو اُس پُر تیقّن لہجے پر دی ہے جو پچیس برس کی عمر سے پہلے نہیں آتا۔ اُس میں کسی بھی سطح پر جھجک نہیں ہے وہ کھڑک کر بات کرتا ہے اور اسی لَے میں شعر کہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعری میں یہ رویّہ مطالعے اور شخصی مضبوطی سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ ناصر بشیر کی غزل سے یہ دونوں باتیں عیاں ہیں کہ اُس نے شاعری کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے اور اس میں ایک توانا آدمی موجود ہے جو کسی ڈر یا خوف کو حیرت کا نام دے کر بیان نہیں کرتا بلکہ اپنی آنکھ پر یقین کرتے ہوئے اپنے مشاہدے کو سخن بناتا ہے۔ وہ کسی لمحے بھی اپنے اعتماد کو ٹھیس لگنے سے نہیں بچا سکتا، ظاہر ہے کہ یہ اُس کی عُمر کا تقاضا ہے وقت کے ساتھ ساتھ وہ زمانے، تقدیر اور اپنے رویّے کو سمجھ جائے گا کیونکہ مختلف رویّوں کے اس جہان میں وہ ہر شے کے رویّے پر نظر رکھتا ہے، کہیں اُسے جمود کی کیفیت نظر آتی ہے وہ سوچتا ہے کہ جو حالات اُس نے تاریخ یا شاعری کی کتابوں میں پڑھے تھے لوگ اُس سے ایک قدم بھی آگے نہیں گئے وہ جب اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ہر دَور کی بڑی تبدیلی کا آغاز لوگوں کے رویّے میں تبدیلی سے ہوتا ہے۔ اُس وقت اُسے یہ کہنا پڑ جاتا ہے۔ اس شہر کے لوگوں کا رویّہ نہیں بدلا۔ چونکہ وہ اعتماد والا نوجوان ہے اس لیے پُر اُمید بھی ہے۔ اس رویّے کے پیشِ نظر اُس کو کبھی کبھی یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ہم کتنے ایک سال کے اندر بدل گئے۔ معاشرتی سطح پر لاشعوری طور پر رُو نما ہونے والی تبدیلیوں پر بھی اُس کی نظر ہے۔ یعنی زندگی کی ہر سطح خواہ وہاں جمود ہے یا تغیر، ناصر بشیر وہاں تک رسائی چاہتا ہے۔ اُس کے ہاں فکری سطح پر کچھ کر دکھانے کی خواہش تڑپتی نظر آتی ہے۔

رویّوں کے اس مطالعے اور تجزیے کے دوران وہ کہیں بھی اپنی شناخت کے مسئلے سے دستبردار نہیں ہوتا۔ جب کسی کو یہ احساس دلایا جائے کہ تم نہیں ہو تو وہ کہتا ہے کہ میں ہوں اور بڑی شان سے ہوں یہ ردِ عمل اکثر اوقات خود ستائی کا مرض بن جاتا ہے اور کہیں کہیں اپنے ہونے کا یقین دلانے کا خوبصورت احساس بن کر اُبھرتا ہے۔ ہمارے عہدِ کم نظر میں نئے شعراء کے ہاں جو بآوازِ بلند اپنی تعریف کرنے کا رُجحان پیدا ہوا ہے وہ سراسر منفی ردِ عمل ہے لیکن یہ بھی نہیں کہ زمانہ سبزۂ نو دمیدہ کے مانند کھِل کر آگے نکل جائے بلکہ ایک دُوسرے کو روند کر آگے نکلنے کے اس دَور میں شناخت کے مسئلے کو مرض نہیں بننے دینا چاہیے۔ اس طرح آدمی تنگنائے ذات سے باہر نکل کر دُنیا کی کھُلی فضا کا نظارہ نہیں کر سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ نوجوانوں

کو اپنے جسموں تک محدود رکھنے کے تمام سامان مہیا کیے جا رہے ہیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ دریدہ دہن ہو جائیں۔ اس دھندلکے میں آواز کا چراغ جلا کر سفر جاری رکھنا آسان کام نہیں کیونکہ جہاں ایک طرف کوئی گالیاں دے رہا ہو اور دوسری طرف کوئی مدھم سُروں کو گنگنا رہا ہو لوگوں کی توجہ وقتی طور پر پہلے شخص کی طرف ہو گی کیونکہ نغمہ تو وہاں لطف دیتا ہے جہاں اندر کے سناٹے باہر نکل کر رقص کرنے لگ جائیں۔ ناصر بشیر متوازن شخص ہے نغمے پر یقین رکھتا ہے کہ اُس کو گالی دینا نہیں آتا۔

ناصر بشیر کے ہاں محبت کے ضمن میں چاہنے سے زیادہ چاہے جانے کی خواہش کا اظہار ملتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُس کو ماضی میں نظر انداز کر کے جو حق تلفی کی گئی اُس کا ازالہ کیا جائے۔ اس نسل کا کوئی بھی نوجوان شان الحق حقی جتنا بڑا دل کر کے یہ نہیں کہہ سکتا

تم سے اُلفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنّا تھی کہ چاہے جاتے

بلکہ اس کے برعکس وہ چاہے جانے کے مطالبے سے دستبردار نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ محبت کی ضرورت کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ ناصر بشیر کے ہاں یہ طرزِ احساس بہت نمایاں ہے۔ "منظر بدل گئے" کی غزلوں کو اس حوالے سے ضرور دیکھئے گا کہ جہاں وہ تلخ ہوتا ہے وہاں اَن کہی کہانی یہی ہوتی ہے کہ ہم کو محبتوں کی ضرورت زیادہ ہے۔ چلتے چلتے اُس کا ایک شعر دیکھیں

وہ آفتاب ہے میں منجمد زمانہ ہوں
اُسے کہو کہ مرے پاس سے گزر جائے

مجھے یقین ہے کہ اُس کی مضبوط شخصیت اس محرومی کے احساس پر جلد غالب آ جائے گی۔ وہ چاہے جانے کی ساعت سے نکل کر چاہنے کے زمانوں میں داخل ہو جائے گا۔

ہر چند ہمارے ہاں ۶۰ کی دہائی میں غزل کو عروج حاصل ہوا اور ابھی تک غزل اس سحر سے پوری طرح باہر نہیں نکل پائی۔ لیکن اس کو زائل کرنے کے لیے برہنہ حقیقت نگاری کو فروغ دیا گیا۔ روٹی کپڑا اور مکان کے نعرے اور اقبال ساجد کی غزل نے حقیقت نگاری کو فروغ دیا۔ لوگوں کی توجہ اُس غزل نے حاصل کی جس میں بنیادی اور وقتی مسائل کا ذکر تھا۔ اقبال ساجد بڑا ہنرمند تھا اُس نے اپنا جواز پیدا کر لیا لیکن اُس کے زیرِ اثر کم و بیش تمام شعراء نے غزل کی

جمالیاتی سطح کو بُری طرح متاثر کیا۔ اس خامی کے باوجود غزل کا یہ دھارا غزل کی مین سٹریم میں داخل ہوگیا۔ اُس کا امتزاج ۸۰ء کی دہائی کے کُچھ شعراء کے ہاں دکھائی دینے لگا ہے۔
ناصر بشیر ہر چند اس دہائی کے آخر میں آنے والا شاعر ہے لیکن اس نے اسی حوالے سے اپنی پہچان کرانے کا پہلا مگر مضبوط قدم اُٹھایا ہے۔ اگر وہ گابرئیل گارسیا مارکیز کے فکشن کا مطالعہ کرلے اور ادھر بچپن میں سُنی ہوئی جادوئی کہانیاں اپنے ذہن میں تازہ کرے تو جادوئی حقیقت نگاری میں کوئی کارنامہ سرانجام دے سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حقیقت نگاری کو بہرحال ماورائے حقیقت تک کا سفر کرنا چاہیے۔

ہمارے ہاں جب بھی کوئی نوجوان شعر کہنا شروع کرتا ہے ہم اس کے امکانات پر نظر رکھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کون ہے اور کدھر جانا چاہتا ہے۔ اُس کے زیادہ دیر سفر کرنے کا اندازہ اس کے مسائل کی نوعیت سے لگایا جاتا ہے۔ ایسا بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب کسی نوجوان کے مسائل حل ہوئے اُس کے پاس شعر کہنے کے لیے کوئی موضوع نہ بچا۔ اُس نے کوشش بھی کی لیکن وہ بات نہ بنی جو بننا چاہیے تھی۔ اس لیے کسی بھی نوجوان کو ابتدا ہی سے ایسے مسائل کو دل میں جگہ دینی چاہیے جو اَبدی نوعیت کے ہوں یا پھر وہ چھوٹے چھوٹے مسائل جنھیں وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہو جانا ہوتا ہے اُن کو جنرلائز کرنے کی صلاحیت پیدا کرلینا چاہیے کہ اس طرح کسی بھی موڑ پر کوئی شاعر فکری تنگ دامنی کا شکار نہیں ہوتا اور نہ ہی ریاضت کے زور پر اپنے آپ کو دُہراتا رہتا ہے۔ ناصر بشیر نے جن مسائل سے اپنی شاعری کا خمیر اُٹھایا ہے وہ انتہائی ذاتی ہیں جن کا ذکر میں ابتدا میں کرہی چکا ہوں لیکن اُس نے انھیں اجتماعی مسائل کی صورت میں دیکھنے کا سلیقہ قائم کیا ہے۔ وہ جب یہ سوچتا ہے کہ میں ایک سال کے اندر کتنا بدل گیا ہوں تو اس سوچ کو غزل میں یوں بیان کرتا ہے "ہم کتنے ایک سال کے اندر بدل گئے" میں کا صیغہ صرف وہاں بیان کرتا ہے جہاں جمع کے صیغے کے بغیر بھی اجتماعی بات کی جا سکے۔ غرض وہ خُوبیاں جو کسی کے اچھے شاعر بننے کی ضمانت ہو سکتی ہیں ناصر بشیر نے اُن کو نہ صرف کلاسیکی شاعری کے مطالعہ سے سمجھا ہے بلکہ وہ اُن پر عمل پیرا بھی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تمنّا کا دوسرا قدم کہاں پڑتا ہے۔

عباس تابش

غزل سے پہلے

غزل میں ایسی کون سی بات ہے کہ ولی دکنی سے لے کر غالب تک، پیچ دار رستوں پر سفر کرتی ہوئی، اس انداز میں پہنچی کہ تھکن کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا بلکہ پہلے کی نسبت تازہ دم دکھائی دیتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیران کر دینے والی بات یہ ہے کہ اس نے غالب سے لے کر ناصر بشیر تک کا فاصلہ بھی خوش اسلوبی کے ساتھ طے کر لیا۔ اس طویل سفر کے دوران زمانے نے بہت اتار چڑھاؤ دیکھے۔ شہر کے شہر برباد ہو گئے، سروں کی فصلیں کٹیں، لہو کی نہریں بہائی گئیں۔ جغرافیائی سرحدیں تبدیل ہوئیں۔ انسان فطرت کی گود سے اچھل کر مصنوعی ماحول میں آ گرا۔ معصومیت پر مبنی دانش کا سفر ختم ہوا تو سائنس نے اپنی ہشیاری اور چالاکی دکھائی بڑی بڑی تحریکیں چلائی گئیں۔ کچھ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئیں کچھ فضاؤں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر کے معدوم ہو گئیں۔ آسمان نے زمین پر یہ تمام کھیل تماشے دیکھے۔ ان کھیل تماشوں کے دوران کئی دفعہ یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ اب شاعری کا کوئی جواز نہیں رہا۔ نیا زمانہ ہے حقیقت کی بات ہونی چاہیے۔ اب انسان کو خیالی دنیا سے نکل آنا چاہیے۔ غزل کو خاص طور پر طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعری کو خیالی دنیا کیوں کہا گیا یہ تو خالصتاً شعور اور عقل کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ شاعری نے تو ہر دور کے انسان کو خیالی دنیا میں لے جا کر اسے حقیقی دنیا کے منظر دکھائے ہیں۔ غالب نے کہا تھا

ع لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

سائنس کا علم جاننے والوں نے اس بات کو ثابت بھی کیا۔ اقبال نے ستاروں سے آگے اور جہانوں کی خبر دی تو عقل والوں نے اس کی تصدیق بھی کر دی۔ سو شاعری ہوتی رہی۔ غزل بھی کہی گئی اور نظم بھی۔ غزل تو بہت زیادہ کہی گئی۔ آج آپ کوئی ادبی رسالہ اٹھالیں اس میں غزلوں

کی بھرمار ہوگی۔ افسانے دو چار سے زیادہ نہیں ہوں گے غزلوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی ہوتی ہے جا بجا ہونے والے مشاعروں میں غزلوں کے شعر گونج رہے ہوتے ہیں۔ اخبارات کے ادبی حصوں میں بھی غزلیں ضرور شامل کی جاتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر ماہ غزل کی شاعری کے دو چار مجموعے مارکیٹ میں آتے ہیں۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ یہ غزلیں کس معیار کی ہوتی ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ غزل آج کے ترقی یافتہ اور تیز رفتار دور میں بھی اسی طرح کہی جا رہی ہے جیسے دکن کے سست رفتار معاشرے میں کہی گئی۔ زمانے نے اتنی کروٹیں بدلیں کہ بہت سی اصناف کا تو بھرکس ہی نکل گیا اور اب ان کا نام و نشان تک دکھائی نہیں دیتا لیکن غزل ایک ایسی صنف ہے جس نے ہمیشہ اپنے وجود کو برقرار رکھا، نہ صرف وجود کو برقرار رکھا بلکہ ہر دور میں اپنی ایک الگ شناخت اور پہچان بھی رکھی، میرؔ کی غزل اپنے عہد کی شکست و ریخت کی سچی تصویر ہے۔ دردؔ کی غزل میں تصوّف کی وہ لہریں موجزن نظر آتی ہیں جو اس وقت کے معاشرے کی رگوں میں خون کی طرح گردش میں تھیں۔ غزل غالبؔ تک آئی تو اس میں بھی وہی ٹھہراؤ اور وقار آچکا تھا جو معاشرے میں کسی حد تک نمایاں ہونے لگا تھا۔ اقبالؔ نے غزل کہی تو وہ قومی اور ملّی امنگوں کی عکاس بن گئی۔

دراصل غزل میں زندگی کی سی وسعت ہے۔ جس طرح زندگی اپنے اندر تمام موسم، رنگ، واقعات، جذبے، تحریکیں، چہرے، نظریے اور رویّے سمو لینے پر قادر ہے اسی طرح غزل بھی ان سب عناصر کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ جس طرح زندگی اپنا رنگ بدلتی گئی بالکل اسی طرح غزل بھی اپنا چولا بدلتی رہی یعنی یہ صنف زندگی کا بھرپور ساتھ دیتی رہی۔ زندگی کے ساتھ گہرا ربط ہی اس صنف کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور مستقبل میں بھی زندہ رکھے گا۔

زندگی کے جتنے منظر میرے شعور کا حصّہ بنے وہ سب میری غزل میں آپ کو دکھائی دیں گے۔ بدلنا ارتقائی عمل کی نشانی بھی ہے اور زندگی کی خاصیت بھی۔ بدلتے منظروں کو میں نے غزل کا روپ دینے کی کوشش کی ہے۔

ناصر بشیر

غزلیں

۱۹۸۷ — ۱۹۹۳

دستار گر نہ جائے سر سے کہیں زمیں پر
ہم آسماں کی جانب ڈر ڈر کے دیکھتے ہیں

○

منظر بدل گئے، پسِ منظر بدل گئے
حالات اپنے شہر کے یکسر بدل گئے

سُورج کے ڈُوبنے پہ نہ حیراں ہوئے کبھی
اب سوچتے ہیں کتنے کیلنڈر بدل گئے

قائم ہے اِک روایتِ دیرینہ ظلم کی
بازو بدل گئے کبھی خنجر بدل گئے

کیا کُچھ بنامِ عدل یہاں ہو نہیں رہا
جو فیصلے کیے گئے اکثر بدل گئے

پہلے سے خدّوخال نہ پہلے سے ہیں خیال
کتنا ہم ایک سال کے اندر بدل گئے

پہلی مئی کی، سولہ دسمبر اُداس ہے
لگتا ہے جیسے سارا کیلنڈر اُداس ہے

دِیوار خستہ حال ہے اور دَر اُداس ہے
جب سے کوئی گیا ہے مِرا گھر اُداس ہے

اِک بار وُہ مِلا تھا مجھے بے رُخی کے ساتھ
اُس دِن سے دِل کا شہر برابر اُداس ہے

رنگینیوں میں کِس نے بکھیری ہیں زردیاں
دِیوار پر بنا ہُوا منظر اُداس ہے

دیکھی ہے اُس کی آنکھ میں پہلی دفعہ نمی
یُوں لگ رہا ہے جیسے سمندر اُداس ہے

ہم چھوڑ آئے نیند میں اپنی سماعتیں
واعظ اِسی لیے سرِ منبر اُداس ہے

یُوں چاند چُپ کھڑا ہے سرِ دشتِ آسماں
جیسے زمین پر کوئی بے گھر اُداس ہے

مُلتان جا کے کوئی اُسے یہ پیام دے
لاہور میں تمھارا سُخنور اُداس ہے

○ مزدوروں کا عالمی دن ★ سقوطِ ڈھاکہ کا دن

○

مثالِ برگِ خزاں مَیں ہَوا میں اُڑتا ہُوں
تلاشِ رزق میں نِکلا ہُوا پرندہ ہُوں

مَیں جاؤں گا تو کوئی آفتاب آئے گا
مجھے خبر ہے کہ مَیں صُبح کا ستارہ ہُوں

مرے وجُود پہ اُترا ہے تشنگی کا عذاب
مگر یہ زعم کہ کتنا قریبِ دریا ہُوں

جواز اِس سے بڑا ہو گا کیا جُدائی کا
گلابِ تازہ ہے تُو، مَیں ہَوائے صحرا ہُوں

مِرا قبیلہ مجھے مسخ کر کے چھوڑے گا
لِکھی ہے جس پہ صداقت مَیں ایسا چہرہ ہُوں

آنکھیں مُندی مُندی سی تو لب تھے سِلے سِلے
ہم کو جلا گئے ہیں شرارے بُجھے ہُوئے

اب کے مِلا تو اُس کے خیالات ہی تھے اور
چہرے کے خدّ و خال بھی بدلے ہُوئے سے تھے

اِس بار بھی نہ ہم سے کوئی بات ہو سکی
بس ایک دوسرے کو کھڑے دیکھتے رہے

اِک عُمر جس نے ضبط کیا اپنے آپ پر
کیسا ہو گر وُہ شخص سرِ بزم رو پڑے

نکلے تھے ایک ساتھ سفر پر تمام لوگ
لیکن ذرا سی دُور چلے تو بکھر گئے

ناراض دوستوں کو منا لے کسی طرح
تسبیح کے جو بکھرے ہیں دانے سمیٹ لے

پھیلے تو کائنات پہ ہم ہو گئے محیط
سمٹے تو اپنی ذات کے اندر سمٹ گئے

ناصر بشیر پہلے ہی معلوم تھا ہمیں
وہ بھُول جائے گا سبھی وعدے کیے ہُوئے

○

مَیں خوابِ گہِ ذات کے اندر نہیں رہتا
انسان ہُوں، ماحول سے کٹ کر نہیں رہتا

مِل جاتی ہے ملبے سے کِسی نام کی تختی
دستار تو رہتی ہے مگر سر نہیں رہتا

وہ پھُول ہے گلچیں کی رسائی نہیں اُس تک
آہُو ہے مگر تیر کی زد پر نہیں رہتا

اُس وقت ستاتی ہے ہمیں نیند کی دیوی
جب ایک ستارہ بھی فلک پر نہیں رہتا

اسبابِ سفر لے کے نکلتے نہیں گھر سے
اس واسطے لُٹنے کا ہمیں ڈر نہیں رہتا

ہر شخص کی باتوں سے یہ اندازہ ہوا ہے
اس شہر میں کوئی بھی قدآور نہیں رہتا

کشتی کا سفر اچھا لگا ہے مجھے ناصرؔ
اب پیشِ نظر ایک ہی منظر نہیں رہتا

○

دردِ تنہائی ہے کیا؟ دیکھتے ہیں
آج ہم اُس کو بُھلا دیکھتے ہیں

کبھی دیکھیں سرِ دیوار چراغ
اور کبھی رقصِ ہَوا دیکھتے ہیں

اس سے پہلے کہ تماشا بن جائیں
آخری تیر چلا دیکھتے ہیں

ہم سے بیچارگیٔ عشق نہ پُوچھ
گُل کو خوشبُو سے جُدا دیکھتے ہیں

تیرے پیراہنِ صد رنگ میں ہم
رُوپ موسم کا نیا دیکھتے ہیں

شہرِ حسرت زدگاں کے سب لوگ
میری آنکھوں میں یہ کیا دیکھتے ہیں

○

انساں کے مقدّر کا ستارہ نہیں بدلا
کہنے کو ترے عہد میں کیا کیا نہیں بدلا

تم اور طلب کرتے ہو کیا اہلِ ہنر سے
کیا کم ہے کہ ہم نے کبھی چہرہ نہیں بدلا

دیوار و در و بام تو بدلے مگر اب تک
اِس شہر کے لوگوں کا رویّہ نہیں بدلا

اِس بار نہیں ہے کسی طُوفان کا خدشہ
اِس بار پرندوں نے ٹھکانا نہیں بدلا

جو نقش بنایا اسے محفوظ رکھا ہے
اِک بار کیا ہے جو ارادہ، نہیں بدلا

○

زنجیرِ انتظار سے مجھ کو رہا کرے
اب کے برس تو آن ملے وُہ، خُدا کرے

اِک اور اینٹ گِر گئی دیوارِ عُمر کی
ہر روز مُجھ سے ڈُوبتا سُورج کہا کرے

آتے ہیں اور لوگ کدالیں سنبھال کر
مینارۂ بدن سے کہو، آسرا کرے

جب دوستوں کے رابطے بھی دُشمنوں سے ہوں
مشکل پڑے تو کِس سے کوئی مشورہ کرے

کمزور ہُوں پر اتنا بھی کمزور مَیں نہیں
دشمن بھی رات دن مرے حق میں دُعا کرے

جو آپ دیوتا وطنِ شاعری کا ہو
مجھ ایسا کم ہُنر اُسے حیران کیا کرے

گزُرے ہُوئے دن ایک دفعہ آتے ہیں ضرور
ناصر بشیر دل سے کہو حوصلہ کرے

ہوا کو مائلِ پیکار کر دیا کس نے
چراغ برسرِ دیوار دھر دیا کس نے

سوال کرتی ہے ہم سے ہماری بے سمتی
مسافرو! تمھیں اذنِ سفر دیا کس نے

یہ سات رنگ بکھیرے ہیں کس نے عالم پر
سیاہ شب کو لباسِ سحر دیا کس نے

یہ مانجھیوں کے مکانوں کو برلبِ دریا
جلا کے راکھ کا اِک ڈھیر کر دیا کس نے

یہ کون دَر بدَری دینا چاہتا ہے ہمیں
یہ بارشوں میں بھی کاغذ کا گھر دیا کس نے

عطا کیا ہمیں کس نے یہ زندگی کا شعور
یہ سانس لینے کا آخر ہُنر دیا کس نے

وہ ایک شہر جو صدیوں میں شہر کہلایا
پلک جھپکنے میں برباد کر دیا کس نے

○

بھٹکنے کا جو اندیشہ ہے وہ معدوم ہونا چاہیے
ہمیں چلنے سے پہلے راستہ معلوم ہونا چاہیے

اگر خاموش رہنا چاہتے ہو تو چلو یُونہی سہی
مگر اِس خامشی میں بھی کوئی مفہوم ہونا چاہیے

زمین اور آسماں کا ذکر جیسے ساتھ ہوتا ہے سدا
ہمیں بھی اس طرح اب لازم و ملزوم ہونا چاہیے

کہانی کار شاید فیصلہ ہی کر نہیں پایا ابھی!
کہانی میں کسے ظالم کسے مظلوم ہونا چاہیے

یہ کیسی بے یقینی کی طرف لے جا رہے ہو تم ہمیں
ہمارے ساتھ کیا ہو گا ہمیں معلوم ہونا چاہیے

جسے دیکھو وہی حالات پر ہے خندہ زن ناصرؔ یہاں
کسی کی آنکھ میں تو مرثیہ برقوم ہونا چاہیے

○

دشمن پہنچ گیا ہے لہو کی لکیر تک
اور ہم! کہ جمع کر نہ سکے اپنے تیر تک

جانا تھا جن کو لوٹ کے، وہ لوگ جا چکے
اے دوست! تیرا ساتھ مَیں دُوں گا اخیر تک

بیٹھا مَیں سوچتا رہا باغِ جناح میں
محدود ہو نہ جائے ہَوا بھی امیر تک

بُدھ بھی گزر گیا ہے، جمعرات آ گئی
اُس نے کہا تھا لوٹ کے آؤں گا پیر تک

سب شاعروں نے شعر کہے تیرے عشق میں
غالب سے لے کے آج کے ناصر بشیر تک

○

اِک شخص کو سُنا تھا کبھی بولتے ہُوئے
اُس روز سے لبوں پہ ہیں تالے پڑے ہُوئے

خالی لفافے بھیجتے رہتے ہیں ہم اُسے
الماریوں میں بند ہیں، سب خط لکھے ہُوئے

منزل سے دُور رہنے کا دُکھ کس لیے نہ ہو
اِک عُمر ہو گئی ہمیں گھر سے چلے ہُوئے

کالک چھُپائی جا نہ سکی جن سے سوچ کی
وہ بھی پہن کے آئے ہیں کپڑے دُھلے ہُوئے

شاید اکائی ذہن کی تقسیم ہو گئی
ہم شعر بھُولنے لگے اپنے کہے ہُوئے

○

ہم جُرأتِ اظہارِ ہُنر کرنے لگے ہیں
کس دشت سے آغازِ سفر کرنے لگے ہیں!

پرواز شکستہ ہے ، لہُو سرد ہُوا ہے
اب مجھ سے بغاوت مِرے پَر کرنے لگے ہیں

خوشبُو کی طرح مَیں تو ہواؤں میں ہوں تحلیل
وہ مجھ کو بھی پابندِ نظر کرنے لگے ہیں

اِک روز تو ہونا ہی پڑے گا اُنھیں بے گھر
تعمیر جو اَب برف کے گھر کرنے لگے ہیں

کچھ سوچ کے لب بستہ تھے احباب جو کل تک
اب ذکر مرا شام و سحر کرنے لگے ہیں

وہ پاؤں میں زنجیر مرے ڈال کے ناصرؔ
لو واقفِ آدابِ سفر کرنے لگے ہیں!

○

بس اِک تمھارے ساتھ ہی دھوکہ نہیں کِیا
اُس نے کِسی کے ساتھ بھی اچھا نہیں کِیا

اپنی سزا طویل کِیے جا رہے ہیں ہم
اب تک مفاہمت کا ارادہ نہیں کِیا

جو جسم کی فصیل میں ہوتا ہے رات دن
اُس کھیل کا کسی نے تماشا نہیں کِیا

دل بھی کِسی سے ہم نے لگایا تو ایک بار
ہم نے کوئی بھی جرم دوبارہ نہیں کِیا

تم بار بار اُس کا لِیے جا رہے ہو نام
جس نے کبھی بھی ذِکر تمھارا نہیں کِیا

ایک عرصے کے بعد آئے گا اور آ کر چلا جائے گا
میری آنکھوں میں گیلے ستارے سجا کر چلا جائے گا

وہ مروّت کے سارے تقاضے بھُلا کر چلا جائے گا
اپنے بھیجے ہوئے سارے تحفے اُٹھا کر چلا جائے گا

آئے گا اور مرے سامنے میرے دشمن کی تعریف میں
وہ زمین آسماں کے قلابے ملا کر چلا جائے گا

یہ جو پانی کا ریلا چلا آ رہا ہے کہیں دُور سے
ریگِ ساحل پہ تصویر تیری بنا کر چلا جائے گا

اپنے بستر پہ مَیں کروٹیں ہی بدلتا رہوں گا مگر
میرے کمرے میں وہ آئے گا اور آکر چلا جائے گا

اس دفعہ بھی کسی تبصرے کی وہ مہلت نہ دے گا ہمیں
آخری فیصلہ جو بھی ہو گا سُنا کر چلا جائے گا

ناصرِ خستہ جاں کو نہ روکو سرِ بزم آنے سے تم
اُس کا کیا ہے کہ وہ تو غزل اک سُنا کر چلا جائے گا

○

ہمیں کِس نے تماشا کر دیا ہے
بھرے میلے میں تنہا کر دیا ہے

جو چاہے اب ہمیں پامال کر دے
کہ خود کو ہم نے رستہ کر دیا ہے

نہیں ہے تم میں اب وہ گرم جوشی
زمانے نے تمھیں کیا کر دیا ہے

ق

کوئی گھر لے گیا ہے آسماں کو
کسی نے خشک ، دریا کر دیا ہے

کبھی صحرا کو گلشن کر نہ پائے
مگر گلشن کو صحرا کر دیا ہے

○

رُک جاؤں بھلا کیسے تری راہگزر میں
مَیں بادِ صبا ہُوں، مجھے رہنا ہے سفر میں

ہر پَل مجھے اِک خوف کا احساس ہُوا ہے
آسیب کوئی رہتا ہے شاید مرے گھر میں

اُس پیکرِ خوشبو کی مَیں تصویر بناؤں
اتنا تو کمال آتے مرے دستِ ہُنر میں

دستارِ فضیلت کے مَیں قابل تو نہیں تھا
کیا تجھ کو نظر آیا تھا اس خاک بسر میں

ممکن ہے کڑی دُھوپ بھی سائے میں بدل جائے
شامل ہے تری یاد مرے رختِ سفر میں

کسی تصویر کے نقش و نگار آنکھوں میں رکھنا
ٹھٹھرتی رُت میں لازم ہے شرار آنکھوں میں رکھنا

اب اُس کا یہ رویّہ ہے مثالِ طفلِ مفلس
کہ جب مِلنا تو اشکوں کی قطار آنکھوں میں رکھنا

زمانے بھر کو ہے معلوم اب اپنی کہانی!
ہمیں مہنگا پڑا ہے عکسِ یار آنکھوں میں رکھنا

ابھی چہرے کے پیچھے دوسرا چہرہ مِلا ہے
کبھی راس آ ہی جائے گا خمار آنکھوں میں رکھنا

یہ کِس نے دُھندلے آئینے ہمیں ناصر تھمائے
ہمیں کیوں پڑ گیا آخر غبار آنکھوں میں رکھنا

لہُو میں ٹھہری ہُوئی درد کی سُندرتا جائے
یہ جشنِ شام کا نشّہ بھی اب اُترتا جائے

ہمارے پیچھے چلے آتے ہیں مُسافر اور
رہِ حیات میں کوئی چراغ دھرتا جائے

وُہ آفتاب ہے . مَیں مُنجمد زمانہ ہُوں
اُسے کہو کہ مرے پاس سے گزُرتا جائے

نہیں ہیں اُس میں وُہ پہلی مروّتیں ناصر
وُہ ایک ایک حقیقت کو خواب کرتا جائے

یہ کِس کے زخمِ کفِ پا کا ہے لہُو ناصر
کہ رنگِ خاک بھی مانندِ گُل نِکھرتا جائے

○

رُخصت جسے کیا تھا، وہی مِل گیا ہمیں
لے آیا ہے کہاں سے کہاں راستہ ہمیں

ہر سمت میں دُھویں کی کثافت کے دائرے
کِس عہدِ کم جمال میں رہنا پڑا ہمیں

گر کھیلتے تو خُوب تھا یہ زندگی کا کھیل
ہم ڈھونڈتے کِسی کو، کوئی ڈھونڈتا ہمیں

جو میرے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چلا
اُس کی شبیہہ دیکھتا ہوں گردِ راہ میں

تنہائی اپنے کمرے کی دِل میں سمیٹ کر
آخر تمھارے شہر سے جانا پڑا ہمیں

○

اُس پار بھی سخت تیرگی ہے
دیوار گرا کے دیکھ لی ہے

دستار رکھی ہوئی ہے گروی
مفلس کی عجیب زندگی ہے

خواہش کو کہاں میں لے کے جاؤں
شیشے کی طرح بکھر گئی ہے

ہے تیز ہوا بھی ساتھ میرے
اور ہاتھ میں اِک چراغ بھی ہے

تنہا ہوں ہجومِ غم میں ناصر
کیا خوب مآلِ دوستی ہے

○

راز طشت از بام ہونا تھا ہُوا
خاص کو بھی عام ہونا تھا ہُوا

ضبط جس دِل نے کِیا دِن بھر اُسے
شب کو خُون آشام ہونا تھا ہُوا

سامنے پتھّر بھی تھے انسان بھی
حرف کو پیغام ہونا تھا ہُوا

اُونچے شملے جُھک گئے ہیں آخرش
ہر خطاب الزام ہونا تھا ہُوا

جلتے خیمے ، بُجھتے منظر ، حسرتیں
جو ہمارے نام ہونا تھا ہُوا

کسی آواز کے پیچھے گئے ہیں
نجانے کس طرف بیچے گئے ہیں

بہت کچھ ہم نے بدلا ہے، اگرچہ
مقدّر عرش پر لکھے گئے ہیں

تجارت گاہِ دُنیا کا نہ پُوچھو!
یہاں انسان تک بیچے گئے ہیں

گھنے اشجار بھی رستے میں آئے
مگر ہم ہیں کہ بس چلتے گئے ہیں

بسوئے آب پیاسے خواب لے کر
ہم اپنے سایے سے پہلے گئے ہیں

ہم اپنے گھر نہیں لے جا سکے کچھ
ہمیشہ راہ میں لوٹے گئے ہیں

○

تمھارے لمس نے خوشبو کو کر دیا پاگل
پھر اس کے بعد چمن کا چمن ہُوا پاگل

جو مَیں نے اُس سے کہا "مِل کبھی اکیلے میں"
تو اُس نے دِھیرے سے اِک لفظ کہہ دیا "پاگل"

کسی کو چوٹ لگے تو وہ رو ہی دیتا ہے
تُو اپنے صبر کو اتنا نہ آزما پاگل!

کہ ہم تو پہلے ہی سب کچھ لُٹائے بیٹھے ہیں
زمانے! جا کے کسی اور کو بنا پاگل

جو زندگی کے معانی سمجھ گیا ناصر
تمام شہر نے اُس شخص کو کہا پاگل

○

اپنی اوقات میں رہنا اچھّا
جو نہ کر پائیں نہ کہنا اچھّا

خُوب ہے سلسلۂ تارِ نفس
کاغذی ناؤ کا بہنا اچھا

یاد ہے عرضِ وفا اپنی ہمیں
اور تِرا ہنس کے وہ کہنا "اچھّا"

ایک دِن بول اُٹھیں گے پتّھر
کب تلک ظُلم کا سہنا اچھا

تم نے جو بات کہی ہے، سچّی!
تم نے جو رنگ بھی پہنا، اچھّا!

○

آنکھوں کو وقفِ خواب کیا جائے کس لیے
نظّارۂ سراب کیا جائے کس لیے

ہو کس لیے ستائشِ حُسن و جمالِ دوست
یہ کارِ بے ثواب کیا جائے کس لیے

ہم چاہتے ہیں وہ بھی ذرا منجمد رہے
نظروں کو آفتاب کیا جائے کس لیے

اب کیا دلیل دے کوئی اپنے دفاع میں
اب اس کو لاجواب کیا جائے کس لیے

ناصر بشیر اُس سے بچھڑنا ہی تھا ہمیں
خود کو بھلا خراب کیا جائے کس لیے

آسان مرا مرحلۂ زیست جو کر جائے
ڈرتا ہوں کہ وہ بات لبوں پہ نہ ٹھہر جائے

جب تک مرے پَر نکلیں مرے جسم سے باہر
ممکن ہے مری خواہشِ پرواز ہی مر جائے

ہم کون سے رستے پہ چلیں، کون سا چھوڑیں
اِس فکر میں دل سے نہ کہیں عزمِ سفر جائے

یہ کون ہے جو روزنِ دیوار میں ہر شام
جلتی ہوئی آنکھوں کے دِیے روز ہی دھر جائے

احباب سے اس واسطے ملتا نہیں ناصر
ڈرتا ہوں کہ آئینۂ جاں پھر نہ بکھر جائے

○

(اختر حسین جعفری کی نذر)

حیراں مجھے کر گیا ہے کوئی
چپکے سے گزر گیا ہے کوئی

نغمات فضا میں گونجتے ہیں
تنہائی سے ڈر گیا ہے کوئی

منزل کا نشان ڈھونڈنے کو
رستے میں بکھر گیا ہے کوئی

ساحل پہ کھڑے ہیں لوگ غم گیں
پانی میں اتر گیا ہے کوئی

لہجے کی کھنک بتا رہی ہے
آئینہ بکھر گیا ہے کوئی

اِک جلتا ہُوا چراغ ناصرؔ
دیوار پہ دھر گیا ہے کوئی

○

نجانے اِس کے پسِ پردہ کیا کہانی ہے
تمام شہر کو درپیش بے زبانی ہے

ہوا کے اور ہی تیور دکھائی دیتے ہیں
اور اِس پہ ظلم کہ کشتی بھی بادبانی ہے

نہ آسکوں گا تجھے ملنے بعد بارش کے
مرے مکان کے چاروں طرف تو پانی ہے

محافظوں نے جلا ڈالے خود ہی شہر کے شہر
نیا زمانہ، نیا رنگِ پاسبانی ہے

سنبھال رکھی ہے اس دل میں کب سے تیری طلب
یہی تو ایک گئے وقت کی نشانی ہے

جو ہم میں آیا وہ اپنی شناخت کھو بیٹھا
ہماری ذات میں صحرا کی بیکرانی ہے

ہوا کے ہاتھ پہ بیعت کا شوق لے ڈوبا
کہ اب تلک ہمیں درپیش لامکانی ہے

○

صُبح کچھ، شام کچھ، خیال رہا
یہ محبت میں اپنا حال رہا

جنوری میں کبھی دسمبر میں
ذکر تیرا تمام سال رہا

مَیں تجھے آج بھی نہیں سمجھا
تُو مرے واسطے سوال رہا

مَیں کہ آنکھوں سے ہاتھ دھو بیٹھا
تُو کہ چہرے کو ہے سنبھال رہا

○

جُرمِ لب بستگی کی سزا دے مجھے
لوحِ ہستی سے کوئی مٹا دے مجھے

آئینے سے کھُرچ دے مرے عکس کو
مِلنا ممکن نہیں تو بھُلا دے مجھے

روک مت مجھ کو منزل رسا ہونے سے
کوہسارِ انا! راستہ دے مجھے

میرا جلنا مری زندگی کا ثبوت
بُجھتا شعلہ ہُوں مَیں، تُو ہَوا دے مجھے

اندر اندر سُلگنا ہُوا ہے عذاب
اب یہ خواہش ہے کوئی رُلا دے مجھے

○

ہر لمحہ ہم نے بات رکھی ہے یہ دھیان میں
اِک داستان اور بھی ہے داستان میں

یاروں نے ایک آن میں مُجھ کو گرا لیا
کوتاہ رہ گیا تھا مَیں اپنی اُڑان میں

کیلیں سی چُبھ رہی ہیں بدن میں شعاعوں کی
کس نے کیے ہیں چھید مرے سائبان میں

آنکھوں کی خامشی میں سمندر کا شور تھا
لُکنت سی پڑ گئی تھی ہماری زبان میں

لیتے ہیں سانس بھی تو ذرا سوچ کر
ہم لوگ رہ رہے ہیں کسی کے مکان میں

کس نے بکھیر دی ہیں فضا میں اُداسیاں
کس نے بھرا ہے درد پرندے کی تان میں

کچھ لوگ اشک تھے، کچھ تھے مثالِ نجم
کچھ گمُ ہوئے زمین میں، کچھ آسمان میں

ہم نقدِ جسم و جاں سے خریدیں گے کیا بھلا
کچھ بھی تو اب نہیں ہے تمھاری دکان میں

○

نہ توڑے گنبدِ ہجراں نہ آہ بھرنے دے
یہ کون ہے جو بسر زندگی نہ کرنے دے

ہے تیرے بعد کڑی دھوپ کا سفر درپیش
تو اپنی چھاؤں میں پل بھر مجھے ٹھہرنے دے

ابھی تو عکسِ رُخِ یار اِس میں اُترے گا
ابھی سے آئینۂ جاں کو مت بکھرنے دے

مہک اُٹھے گا ترا قریۂ بدن سارا
تُو اپنے پاس سے مُجھ کو ذرا گزرنے دے

یہ زندگی کا سمندر عجیب ہے ناصر
کبھی ڈبوئے ہے مجھ کو کبھی اُبھرنے دے

○

پہلے چہرے دیکھنے کے حوصلے تقسیم کر
شہر کے لوگوں میں پھر تُو آئینے تقسیم کر

اس عذابِ خواب سے باہر نکلنا ہے ہمیں
اے خُدائے شب! تُو لمحے جاگتے تقسیم کر

بے حسی کی انتہا نے سب کو پتھر کر دِیا
اے خُدا! اب جِسم ہم میں موم کے تقسیم کر

منزلوں کے پاس پہنچے تو مسافر بول اُٹھے
اے خُدا! تُو پھر سے ہم میں فاصلے تقسیم کر

ہم بہت پیچھے یقیں کی سرحدوں کو چھوڑ آئے
اب ہمارے درمیاں کچھ وسوسے تقسیم کر

○

بارش کا امکان ہُوا
جلنے کا سامان ہُوا

جب تک تھا ہمراہ کوئی
کیا کیا کُچھ آسان ہُوا

پھر سے ہوائیں بند ہُوئیں
پھر رستہ سنسان ہُوا

تُو اِک جلتا سُورج ہے
دِل میرا مُلتان ہُوا

جب مَیں دستک دینے لگا
ہاتھ مِرا بے جان ہُوا

تیری یادیں پھُول بنیں
دِل میرا گلدان ہُوا

مَیں ہُوں اکیلا، تیرے ساتھ
پُورا پاکستان ہُوا

○

اس دوپہر میں دھوپ کا ظرف آزمائے کون
منزل کی سمت جاتا ہے یہ سائے سائے کون

کاغذ پہ بکھرے خواب تو مٹ جائیں گے کبھی
دل پر لکھے خیال کو لیکن مٹائے کون

ملنا تو ایک دوسرے سے چاہتے ہیں ہم
دیوار ہے جو بیچ میں اُس کو گرائے کون

گھنٹی بجاؤ، نام بتاؤ تو تُو ملے
پہلے کی طرح اب ترے گھر آئے جائے کون

وہ جب ہلا ہے آنکھ سے بہنے لگے ہیں اشک
حالِ دلِ تباہ کو اُس سے چھُپائے کون

فی الحال ایک دوسرے کو کہہ رہے ہیں ٹھیک
اب دیکھنا ہے پہلے بدلتا ہے رائے کون

اس بار تُو نہ ہو گا شریکِ سفر مرا
اک بار آزمائے کو پھر آزمائے کون

اس شہر میں نہیں ہے ترا کوئی خیر خواہ
ناصر بشیر یہ اُسے آخر بتائے کون

○

جو بھی منظر ہو، بُرا لگتا ہے
دیکھنا اب تو سزا لگتا ہے

کبھی کُھلتا ہی نہیں میرے لیے
در ترا بندِ قبا لگتا ہے

تجھ میں ایسی تو کوئی بات نہیں
پھر بھی دُنیا سے جُدا لگتا ہے

خُون تو خُون رہے گا پیارے
یُونہی ہم رنگِ حنا لگتا ہے

در بدر یُونہی نہیں ہے ناصر
چاند کا گھر بھی لُٹا لگتا ہے

○

لگتا ہے زندگی سے الگ ہو گیا ہوں میں
بچّے تو کھیلتے ہیں مگر سو گیا ہوں میں

نکلا تھا ایک روز کسی کی تلاش میں
اُس روز سے نجانے کہاں کھو گیا ہوں میں

حیران کس لیے ہیں مرے فیصلے پہ لوگ
جس سمت فائدہ تھا اُدھر ہو گیا ہوں بس

گو قتل ہو گیا ہوں میں ظالم کے ہاتھ سے
اِک بیج خودسری کا مگر بو گیا ہوں میں

○

مرے مُنہ سے سدا نکلیں گے سچّے بول
مَیں پتّھر کو کہوں آئینہ کیسے بول؟

فصیلِ خواب میں مجُھ کو کِیا محصور
خُدائے شب! ترے کیا ہیں ارادے بول

جنھیں تھا اس زمیں کے حادثوں سے پیار
بھلا کیسے فضاؤں میں وہ اُڑتے بول

اگر تُو بولنا چاہے کبھی اے دوست
تو کوہِ طُور پہ جا کر خُدا سے بول

مجھے تو میری غربت نے رکھا خاموش
تُو کیوں چُپ ہے مقدّر کے ستارے بول!

جو بھی روتا دکھائی دیتا ہے
مجھے اپنا دکھائی دیتا ہے

اور کچھ بھی نظر نہیں آتا
ایک چہرہ دکھائی دیتا ہے

چاند مجھ کو تو لگ رہا ہے اداس
تمھیں کیسا دکھائی دیتا ہے

○

بدن تھکے ہُوئے ، مسدود راستے ہیں دُکھ
جو منزلوں پہ نہ پہنچے وہ قافلے ہیں دُکھ

کِھلے گلاب ، کھُلی کھڑکیاں ، حسیں چہرے
جہاں گئے ہیں وہیں ہم کو مِل گئے ہیں دُکھ

تمھارے نقشِ قدم ، شاخ سے گِرے پتّے
ہماری راہ میں کتنے بِچھے ہُوئے ہیں دُکھ

کِسی کی آنکھ کے آنسُو سوال کرتے ہیں
ستارے ہیں کہ فلک پر چمک رہے ہیں دُکھ

خموشیوں سے تو مفہوم یہ نکلتا ہے
کہ اپنا اپنا سبھی لوگ رو رہے ہیں دُکھ

چھلکنے لگتا ہے آنکھوں کے سُرخ ڈوروں سے
ہم اپنے جسم میں اتنا انڈیلتے ہیں دُکھ

نئے زمانے کا آغاز ہو گیا ناصر!
کسی نے خواب میں آکر چُرا لیے ہیں دُکھ

○

قریۂ وہم و گماں تک آئے
ہم ترے ساتھ کہاں تک آئے

اپنی کم ظرفی کا اظہار کروں
رازِ سربستہ زباں تک آئے

بات کر دی تو پشیمانی کیا
تیر واپس نہ کماں تک آئے

پیاس جو اپنی بجھانا چاہے
حلقۂ تشنہ لباں تک آئے

ابھی جاری ہے "نہیں" کی گردان
دیکھئے کیسے وہ "ہاں" تک آئے

مطمئن پھرتے ہیں یُوں صحرا میں
جیسے ہم آبِ رواں تک آئے

ہم بہاروں کی طلب ہیں ناصرؔ
آخرش شہرِ خزاں تک آئے

○

یہ کیسا زندگی کا معرکہ ہے
خود اپنے آپ سے لڑنا پڑا ہے

مرے پیشِ نظر سو منزلیں ہیں
مگر پَیروں تلے اِک راستہ ہے

جو سب سے معتبر تھا شہر بھر میں
مجھے اُس شخص نے دھوکہ دیا ہے

مَیں اپنے خال و خد کو ڈھونڈتا ہُوں
مرا آئینہ دُھندلا ہو گیا ہے

جہاں سے یاد رکھنا تھا ضروری
ہمیں قصّہ وہیں سے بھولتا ہے

کبھی دیکھا تھا اک زخمی پرندہ
لہُو آنکھوں میں اب تک ناچتا ہے

مری آنکھوں میں اشک آئے تو ناصرؔ
ستارہ آسماں پر ہنس دیا ہے

○

بھلا اِس کے علاوہ حُسن کا معیار کیا ہے
جسے ہم دیکھتے ہیں شہر اُس کو دیکھتا ہے

وہ ہم سے پیار کرتا ہے، یہ ثابت ہو گیا ہے
وگرنہ کون جاتے شخص کو یُوں دیکھتا ہے

محبّت میں ہمیں درپیش سو مجبُوریاں ہیں
کِسی کو یاد رکھنا ہے، کِسی کو بُھولنا ہے

بِچھڑتے وقت اُس کی آنکھ میں آنسو نہیں تھے
اچانک مِل گیا ہے راہ میں تو رو دِیا ہے

کوئی تو بارگاہِ حُسن میں دے گا گواہی
ہمارے ساتھ ناصرؔ اک ستارہ جاگتا ہے

○

کوئی بھی خواب نہ تعبیر کے در تک پہنچا
راہ میں بھٹکا مسافر نہیں گھر تک پہنچا

جس نے اک بار تجھے دیکھا ، تجھے چاہا ہے
اپنی مرضی سے ہر اک شخص بھنور تک پہنچا

آج بھی کوششِ بے سُود بہت کی ہم نے
آج بھی ہاتھ ہمارا نہ ثمر تک پہنچا

بانٹتا پھرتا ہے تُو شہر میں خیراتِ سکُوں
تجُھ سے ممکن ہو تو اس خاک بسر تک پہنچا

میرے اشعار جو سُنتا ہے وہ گھائل ہو جائے
اَثرِ تیغ مرے دستِ ہُنر تک پہنچا

○

آ مری زمین پر
ہیں سبھی زمین پر

بین کرنے آئی ہے
زندگی زمین پر

آسمان ! بھیج دے
روشنی زمین پر

اِک جہاں بساؤں گا
مَیں اِسی زمین پر

تجھ کو مات دُوں گا مَیں
تیری ہی زمین پر

کوئی آسماں پہ ہے
اور کوئی زمین پر

شاخ شاخ پیڑ کی
گر پڑی زمین پر

مستقل فساد ہیں!
عارضی زمین پر

کل بھی خاک زاد تھے
آج بھی زمین پر

پُوچھتا ہے آسماں
کیا بنی زمین پر

○

چُپ کھڑا ہے آسماں!
کیا خُدا ہے آسماں؟

لوگ سو چکے مگر!
جاگتا ہے آسماں

رہنا ہے زمین پر
سوچنا ہے آسماں

جو بھی کر رہے ہیں ہم
دیکھتا ہے آسماں

تُجھ سے مِل کے یُوں لگا
چھُو لیا ہے آسماں

کون اس زمین پر
رکھ گیا ہے آسماں

روز اِک نئی زمیں
اِک نیا ہے آسماں

شہر کا مکین بھی
ڈھونڈتا ہے آسماں!

میرے واسطے کوئی
بن گیا ہے آسماں

جانے کِس کے سوگ میں
رو رہا ہے آسماں

○

سناٹے کی جھیل میں آج تلاطم کیسا برپا ہے؟
شاید چاند نے اِس میں اپنے عکس کا پتھر پھینکا ہے

سارے پرندے نقل مکانی کرکے دُور سدھارے ہیں
یُوں لگتا ہے بستی میں پھر طُوفاں آنے والا ہے

اُس کو بھی احساس ہُوا ہے ان مغموم فضاؤں کا
آج وہ اپنے گھر سے کالا لباس پہن کے نِکلا ہے

مَیں بھی درد کی تاریکی میں ہو جاؤں گا اب تحلیل
ہجر کی شام ہے اور پھر تیری یاد کا پھیلتا سایہ ہے

کب تک دِل کی خاموشی اور سناٹے کو پُوجیں گے
آؤ ہم بھی دیکھنے جائیں شہر میں شور سا کیسا ہے؟

وہ بھی ایک عذاب میں ہے اور میں بھی ایک عذاب میں ہُوں
مُجھ کو بھُولنا چاہے وُہ اور مجھ کو یاد وُہ آتا ہے

کِس کِس چہرے کو پڑھ کر تم ناصرؔ اشک بہاؤ گے
آج غموں کی ایک کہانی لکھی چہرہ چہرہ ہے

○

کبھی بھید اُس کا کھُلا نہ تھا
مگر آدمی وہ خُدا نہ تھا

مری سرخوشی کا نہ پُوچھ تُو
بڑا مختصر وہ فسانہ تھا

مُجھے کوس لیتا تھا رُوبرُو
مرا دوست دِل کا بُرا نہ تھا

مرا سایہ بھی مرے ساتھ ساتھ
سرِ رہگزار چلا نہ تھا

مُجھے اتنا یاد ہے تیرے بعد
مرے پاس کچُھ بھی بچا نہ تھا

مُجھے ڈُوبنا ہی تھا نیل میں
مرے پاس کوئی عصا نہ تھا

اُسے آج روتے بھی دیکھنا
جو کبھی اُداس ہُوا نہ تھا

کہنے کو ساتھ ساتھ چلے جا رہے ہیں ہم
سوچیں تو ایک عُمر سے بچھڑے ہُوئے ہیں ہم

تم کیا گئے کہ ذہن سے سب کچھ اُتر گیا
اِس سوچ میں ہیں دیر سے کیا سوچتے ہیں ہم

معمولِ زندگی کا وہی ہے جو سب کا ہے
پڑتے ہی شام لوٹ کے گھر آگئے ہیں ہم

دنیا میں جی رہے ہیں کہ بیگار کیمپ میں
اِک سانس کے عوض کئی دُکھ جھیلتے ہیں ہم

آئے گا اور کوئی مٹا جائے گا ہمیں
دیوار پر لکھا ہُوا نعرہ ہُوئے ہیں ہم

پہلے خزاں کی رُت میں بھی لاتے تھے برگ و بار
اب کے بہار آئی تو مُرجھا گئے ہیں ہم

ناصرؔ بشیر اب کے سنبھلنا محال ہے
اس بار آسمان سے ایسے گرے ہیں ہم

○

ترے خیال کو دل سے نکال رکھا ہے
پرائے شہر میں خود کو سنبھال رکھا ہے

اگرچہ جانتے ہیں ہاتھ کچھ نہ آئے گا
کنویں میں ڈول مگر ہم نے ڈال رکھا ہے

مکانِ چشم کو خالی نہ تم سمجھ لینا
غمِ زمانہ کو اس میں سنبھال رکھا ہے

میں جو بھی لفظ لکھوں وہ ستارہ بن جائے
مرے قلم میں یہ کس نے کمال رکھا ہے

عروسِ ذات کو بھی مطمئن کیا ہم نے
زمانے! تیرا بھی ہم نے خیال رکھا ہے

○

وہی آب و ہوا کے شاخسانے ہیں
ابھی گھر میں رہو، موسم پُرانے ہیں

اگر چاہیں تو تُم کو مضطرب دیکھیں
ہماری دسترس میں وہ زمانے ہیں

تمھیں جب ڈھونڈتے ہیں تُم نہیں ملتے
تمھارے شہر میں کتنے ٹھکانے ہیں؟

خُود اپنے ساتھ بھی انصاف کرنا ہے
ہمیں دُنیا کے رِشتے بھی نبھانے ہیں

ہمیں دُشمن نہیں ، احباب ماریں گے
کہ اُن کے دُشمنوں سے دوستانے ہیں

اگرچہ داستاں پُوری سُنائیں گے
مگر کچھ واقعے تم سے چُھپانے ہیں

ہماری آنکھ میں جو خواب ہیں ناصر
ہمارے دوستوں ہی نے چُرانے ہیں

○

وہ رُوح لے گیا ہے ، مرا جسم لے گیا
لگتا ہے کچھ نہ کچھ وہ مجھے پھر بھی دے گیا

میری تو ایک بات بھی اُس نے نہیں سُنی
وہ شخص اپنی رام کہانی کہے گیا

مَیں اپنے سیلِ اشک کو قابُو کیے ہُوئے
اُس کو فصیلِ شہر تلک چھوڑنے گیا

دستورِ بزمِ دہر کے کتنے عجیب ہیں
کوئی ذلیل ہو کے کوئی شان سے گیا

○

شاخ پر اک پات ہونا چاہیے
تجھ کو میرے ساتھ ہونا چاہیے

عمر بھر کے واسطے کچھ ہو نہ ہو
تیرا میرا ساتھ ہونا چاہیے

آنکھ میں حیرانیوں کا عکس ہو
گال پر اِک ہاتھ ہونا چاہیے

اپنے اندر جھانک کر دیکھوں کبھی
انکشافِ ذات ہونا چاہیے

نام تیرا کچھ بھی ہو، میرے لیے
دافعِ آفات ہونا چاہیے

آسماں کی وسعتیں بھی ہم میں ہوں
ایک ہو کر سات ہونا چاہیے

رات بھر کا جاگنا اچھا لگا!
اب یہی ہر رات ہونا چاہیے

○

اس شہر کے مزاج میں شامل ہے کیسی بات
جیسے ہوں لوگ سامنے کرتے ہیں ویسی بات

رہتا ہوں تیرے سامنے خاموش اس لیے
منہ سے نکل نہ جائے کہیں ایسی ویسی بات

سب دوست اس کی تلخ نوائی سے تنگ ہیں
ہم نے تو اس میں کوئی نہیں دیکھی ایسی بات

وہ چُپ کھڑا رہا تھا مگر آنکھوں میں
کہہ کر چلا گیا ہے ہمیں کیسی کیسی بات

ناصر بشیر خود کو اکیلا ہی پاؤ گے
لوگوں میں ڈھونڈتے رہے گر اپنے جیسی بات

○

ہر اِک روایتِ کہنہ سے منحرف ہو کر
مَیں خوش نہیں ہُوں زمانے سے مختلف ہو کر

ہماری ذات کی تہ تک کوئی نہیں پہنچا
اب اپنے آپ پہ دیکھیں گے منکشف ہو کر

تمھارے بعد گزارے ہیں روز و شب ہم نے
خود اپنی ذات کے زنداں میں معتکف ہو کر

ہماری سمت کبھی اُس چراغِ روشن کی
نہ روشنی کبھی آئی تھی منعطف ہو کر

خود اپنا لہجہ بنانا پڑا مجھے ناصر
کسی کے رنگِ تغزّل کا معترف ہو کر

خوشبو میں حوِ خواب جوانی سے گفتگو
شب بھر رہی ہے رات کی رانی سے گفتگو

کردار ہی سمجھنے لگا ہے ہمیں بھی شہر
ایسی ہوئی ہے اب کے کہانی سے گفتگو!

شیشی میں بند ہے ترا بھیجا ہوا گلاب
رہتی ہے روز تیری نشانی سے گفتگو

ناصر بشیر تیرا تو معمول ہو گیا
دریا کنارے بیٹھ کے پانی سے گفتگو

○

اندر کا آدمی کبھی باہر نہ آسکا
جو دِل کا مدّعا تھا زباں پر نہ آسکا

ہر لمحہ اشک بار رہی ہے ہماری آنکھ
معمول پر کبھی یہ سمندر نہ آسکا

نکلے تھے یوں تو لوگ تعاقب میں بے شمار
لیکن کوئی بھی تیرے برابر نہ آسکا

اے شہر یار ! میرا تو دامن تھا چھید چھید
اچّھا ہُوا کہ مَیں ترے در پر نہ آسکا

خالی رہا ہے کاسۂ چشم اپنا عُمر بھر
حصّے میں اپنے ایک بھی منظر نہ آسکا

○

شبِ تیرہ میں ہے درکار ستارا چہرہ
اس لیے ڈھونڈتے رہتے ہیں تمھارا چہرہ

عُمر گزُری ہے، خدوخال وہی ہیں اپنے
وقت کے سامنے اب بھی ہے صف آرا چہرہ

جمگھٹے میں بھی رکھی جائے الگ اپنی شناخت
کھو کے مشکل ہی سے مِلتا ہے دوبارا چہرہ

تم ہمیں دیکھ کے آئندہ کی بابت سوچو
گزُرے وقتوں کی کہانی ہے ہمارا چہرہ

اِک یہی خوف ہے لاحق ہمیں ہر پل ناصرؔ
جانے کب چھین لیا جائے ہمارا چہرہ!

کر تو لیا تھا گھر سے نکلنے کا فیصلہ
سو بار پیچھے مُڑ کے مگر دیکھنا پڑا

جب تیرے ساتھ تھا تو کوئی جانتا نہ تھا
تجھ سے بچھڑ گیا تو مَیں مشہور ہو گیا

دِل پر کِسی کا نام لکھا اور مِٹا دیا
اپنا تمام عُمر یہی مشغلہ رہا

آنکھوں کے سامنے ہیں کئی منزلیں مگر
قدموں تلے بچھا ہے فقط ایک راستہ

اُس کے لبوں پہ برف جمی تھی ، جمی رہی
اِک بار بات کر کے مَیں خاموش ہو گیا

ناصر بشیر کِس کی نظر گھر کو کھا گئی
سایہ سا بِچھ گیا مرے آنگن میں خوف کا

○

موسم نے بھی میرے خلاف ہمیشہ سازش کی ہے
بارش ہوئی، جب تعمیر کی مَیں نے خواہش کی ہے

اپنی جانب کوئی مسیحا آنے والا نہیں تو
ہم نے خیابانِ ہستی کی کیوں زیبائش کی ہے؟

جب سے کتابیں پڑھ کے ہم آشفتہ حال ہوئے ہیں
تب سے ساری دُنیا دشمن عقل و دانش کی ہے

گنبدِ بے دَر میں گزُریں گے عُمر کے باقی دن بھی
ہم نے پُکار کے تجُھ کو اک بے فائدہ کاوش کی ہے

آج ترا نام انجانے میں آیا ہماری زباں پر
ورنہ ہم نے اپنے کون سے دُکھ کی نمائش کی ہے

آج ترا نام انجانے میں آیا ہماری زباں پر
ورنہ ہم نے اپنے کون سے دُکھ کی نمائش کی ہے

○

جب بھی کسی سے محبّت ہونے لگتی ہے
مجھ کو خود سے نفرت ہونے لگتی ہے

کبھی کبھی جب اپنے اندر جھانکتا ہُوں
اس ماحول سے وحشت ہونے لگتی ہے

بڑی بڑی باتوں پر چپ رہتے ہیں اور
ذرا سی بات پہ حیرت ہونے لگتی ہے

جب وہ اپنی سماعت کے در بند کرے
کُچھ کہنے کی ہمّت ہونے لگتی ہے

ایک دفعہ جس شخص نے تُجھ کو دیکھ لیا
اُس کو تیری عادت ہونے لگتی ہے

○

آنکھوں میں سو خواب سجائے پھرتے ہیں
پانی میں اِک شہر بسائے پھرتے ہیں

ہم نے وعدہ خلافی کیا اِک شخص سے کی
سارے شہر سے نظریں چرائے پھرتے ہیں

اور کسی کے حوالے کرنا مشکل ہے
کاندھے پر وہ بوجھ اُٹھائے پھرتے ہیں

آخر اِک دن آنکھیں ظاہر کر دیں گی
دِل میں ہم جو راز چھُپائے پھرتے ہیں

ناصرؔ ہم آرام میں بے آرام رہے
اُس کو دیکھ کے بھی گھبرائے پھرتے ہیں

خود اپنی ذات پہ یہ ظُلم کر گئے ہم بھی
حضورِ شاہ میں لے کر ہُنر گئے ہم بھی

مچا رہا تھا قیامت کا شور سنّاٹا
سڑک پہ چلتے ہوئے رات ڈر گئے ہم بھی

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے گِرے پتّے
پھر اس کے بعد لگا یُوں بِکھر گئے ہم بھی

ضرور گِرتا ہے دریا کسی سمندر میں
جِدھر زمانہ گیا ہے اُدھر گئے ہم بھی

نظر ملائی نہ اُس نے بھی ایک لمحے کو
سو اس کے پاس سے چُپکے گزُر گئے ہم بھی

چلے تو چلتے گئے دُور تک ستارے کے ساتھ
رُکا ستارہ تو آخر ٹھہر گئے ہم بھی

○

عجب شے ہے سخن انداز ہونا
کہیں طعنہ کہیں اعزاز ہونا

ذرا سی بات پر ناراض ہونا
نہیں اچھا بہانہ ساز ہونا

ہماری دسترس میں تم نہیں ہو
کبھی خُوشبُو کبھی آواز ہونا

شروع انجام سے ہو گی کہانی
ضروری تو نہیں آغاز ہونا

ابھی ہم دوستوں کے تیر کھالیں
عدو! پھر تم بھی تیر انداز ہونا

(خالد احمد کی زمین میں)

○

چمکا ہے محبّت کا ستارہ لبِ دریا
جب ہم نے بلایا ہے وہ آیا لبِ دریا

لہروں نے ڈبویا ہے کسے، کِس کو اُچھالا
ہم دیکھتے رہتے ہیں تماشا لبِ دریا

لگتا تھا کہ آنکھوں میں کوئی ڈُوب گیا ہے
اِک شخص پریشان کھڑا تھا لبِ دریا

تعمیر میں بھی رکھتے ہیں تخریب کا امکان
جب شہر بسایا تو بسایا لبِ دریا

ہر بابِ ستاروں سے رقم ہم نے کیا ہے
کُھلتا ہے وفاؤں کا شمارہ لبِ دریا

اک ایسی کہانی بھی جسے بھُول گئے ہم
اور ایک دوپٹہ بھی مِلا تھا لبِ دریا

بِچھڑا نہیں جب تجھ سے کوئی شخص بھی ناصرؔ
پھر یاد کِسے کرتا ہے بیٹھا لبِ دریا

○

زندگی کے رنگ آنکھوں سے چُرا کر۔ لے گیا
میرا سب کچھ، ڈُوبتے سُورج کا منظر لے گیا

سنگ ریزے دے کے وہ شیشے کا پیکر لے گیا
جوہری تھا، کوڑیوں کے بھاؤ جوہر لے گیا

پہلے آ کر لے گیا تھا اپنی تصویریں تمام
اب کے وہ آیا تو اپنے خط اُٹھا کر لے گیا

عُمر بھر کی پیاس میرے نام کرنے کے لیے
اپنا صحرا دے گیا میرا سمندر لے گیا

پہلے اُس نے طاقتِ پرواز مُجھ کو بخش دی
پھر نہ جانے کیا ہُوا وہ کاٹ کے پَر لے گیا

دے گیا ہے کون میرے عہد کو بے چہرگی
کِس نے آنکھیں چھین لی ہیں، کون منظر لے گیا

عشق کو جب رہنما میں نے کِیا ناصر بشیر
آنکھ کے رستے مجُھے وُہ دِل کے اندر لے گیا

○

کوئی تو منتظر اپنا بھی ہو گا
کھُلی کھڑکی میں اِک چہرہ بھی ہو گا

چلا جاتا ہے جو کشکول تھامے
کسی دہلیز پر ٹھہرا بھی ہو گا

اگر یہ پاؤں چلنے کو بنے ہیں
یقیناً پھر کہیں رستہ بھی ہو گا

جو سب سے مُسکرا کر مل رہا ہے
کسی کے سامنے روتا بھی ہو گا

سمیٹے ہیں اگر آنکھوں میں دریا
انہیں گالوں پہ پھر بہنا بھی ہو گا

عدالت میں سبھی سچے نہیں ہیں
کوئی تو آخرش جھوٹا بھی ہو گا

جو بچھڑا تھا بھرے میلے میں ناصرؔ
کبھی تنہائی میں ملتا بھی ہو گا

○

جو بھی منظر دیکھنا وہ فاصلے سے دیکھنا
ٹوٹتے بنتے ہُوئے کچھ دائرے سے دیکھنا

شہر بھر میں ڈھونڈتے پھرتے ہو تم جس شخص کو
وہ برآمد ہو گا اِک دِن آئینے سے دیکھنا

تُم سمجھ لینا بہاروں میں خزاں موجُود ہے
جب ہرے پتّے کہیں بکھرے ہوئے سے دیکھنا

دو قدم چلتے ہی ہم کیوں رُک گئے اے ہم سفر
آبلے ہیں پاؤں میں یا آبلے سے دیکھنا !

وہ مکمّل ہے خُدا کی ذاتِ باری کی قسم
چاہتے ہو تم اسے کس زاویے سے دیکھنا

اب کسی بھی شخص کے بارے میں کہہ سکتے نہیں
وہ نہ ہو گا منحرف اپنے کہے سے دیکھنا

گھر سے نکلا ہے سفر کے واسطے ناصرؔ بشیر
وہ پلٹ آئے گا لیکن راستے سے دیکھنا

ناصر بشیر کی سیدھی سچی شاعری دل پر براہِ راست دستک دیتی دکھائی دیتی ہے۔ فنی محاسن پر اس کی گرفت بہت مضبوط ہے اور اس کی غزلوں میں پہلی پہلی محبتوں کا کچا پن کہیں بھی محسوس نہیں ہوتا جبکہ تازگی کو چھوتی ہوئی ایک برجستگی اور بے ساختگی اس کے کلام کی بنیادی صفات میں شامل ہے۔ ناصر بشیر نے اپنے بہت سے ہمعصروں کی طرح کتاب چھپوانے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا اور نہ ہی اس مجموعہ میں کوئی بھرتی کی غزل موجود ہے۔ اس کا یہ مجموعہ اس کے لیے جمپنگ پیڈ کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کے ساتھ آنے والی غزل کی کوئی اُمید وابستہ نہ کی جا سکے۔ ناصر بشیر جو خود ایک زیرک شاعر ہے عمدہ شاعری کے تقاضوں کو نہ صرف یہ کہ خوب سمجھتا ہے بلکہ انھیں بروئے کار لانے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

ظفر اقبال

ناصر بشیر نئی نسل کے ان نوجوان شاعروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جن سے ہم نے بجا طور پر بڑی توقعات وابستہ کی ہیں۔ ناصر بشیر کو بچپن ہی سے ایسے حالات ملے جنھوں نے انھیں زندگی کی پیچیدگیوں کا شعور عطا کیا۔ پھر ناصر بشیر نے زندگی کے مشاہدے اور تجربے میں اپنے وسیع مطالعے کو شامل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں روایت کی اہمیت کو سمجھتے ہیں وہاں یہ بھی جانتے ہیں کہ روایت کب ارتقا کے راستے کی دیوار بن جاتی ہے اور اسے کیسے توڑا جا سکتا ہے۔ وہ معاشرتی زندگی کے تقاضوں اور افراد اور اجتماع کی نفسی ضروریات کا علم رکھتے ہیں۔ ان تمام عناصر نے ان کے ذہن کو جو وسعت، روشنی اور کشادگی عطا کی ہے وہی ان کی شاعری کا وصفِ خاص ہے۔ ناصر بشیر زبان و بیان اور عروض کے تقاضوں سے مکمل واقفیت رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اسلوب میں صحت اور حُسن اور توانائی اور کشش کی خُوبیاں واضح طور پر نمایاں ہوتی ہیں۔ ناصر بشیر کی غزل اکیسویں صدی میں غزل کی کائنات کی طرف کھلنے والی ایک کشادہ کھڑکی ہے۔

ڈاکٹر عرش صدیقی

ناصر بشیر اپنی عُمر سے آگے نکلی خواہشوں اور خوابوں کا تعاقب کر رہا ہے بہت کم عرصے میں وہ ہر عرصۂ عُمر کے لکھنے والوں کا دوست ہُوا ہے۔ اس نے آغاز شاعری سے کیا اور اختتام بھی شاعری پر کرے گا۔ وہ جدید رویّوں کا شاعر ہے اور نئے زمانوں سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اُس نے اُردو غزل کو ایک اور طرح کے محبوب کا تصور دیا ہے۔

وہ مروّت کے سارے تقاضے بُھلا کر چلا جائے گا
اپنے بھیجے ہُوئے سارے تحفے اٹھا کر چلا جائے گا

ڈاکٹر اجمل نیازی

ناصر بشیر آئے اور چھا گئے، بہت کم لوگ اتنے کم عرصے میں اتنی زیادہ کامیابی حاصل کر پائے۔ بہر طور یہ فتح کسی شکست سے عبارت نہیں۔ ناصر بشیر اپنے قدموں پر اپنی رفتار سے آگے بڑھا اور آگے نکل آیا۔ اُس نے کسی کی رفتار کو سامنے رکھ کر اپنی رفتار کا تعیّن نہیں کیا، اب اس کے عہد کو اس کی رفتار کو دیکھ کر اپنی رفتار کا تعیّن کرنا ہوگا کیونکہ منظر بدل چکا ہے۔ 'منظر بدل گئے' ناصر بشیر کے پہلے مجموعے کا نام ہی نہیں حرف و صوت کے موجودہ منظر نامے میں اپنی شمولیت کا اعلان بھی ہے۔ ناصر بشیر کے کلام میں وہ تمام خُوبیاں ہیں اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں۔

خالد احمد

ناصر بشیر عمر کے اعتبار سے نوجوان لگتا ہے مگر اس کی فنی گرفت اور پختہ فکری کو سامنے رکھیں تو ماننا پڑتا ہے کہ

"ذیبے تری نگاہ دلآویز ابھی سے ہے"

ناصر بشیر کا مشاہدہ تیز اور اظہار خُوبصورت ہے اس کی غزل تازہ کلامی کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس کے اوّلین مجموعہ کلام کے مطالعہ سے قلب و ذہن میں شگفتگی اور تازگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اس کی شاعری مُوسلا دھار بارش نہیں بلکہ ہلکی ہلکی پھوار ہے جس سے فضا میں ایک نکھار اور خوشگواریت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

رُوحی کُنجاہی

جو مَیں نے اُس سے کہا ”مِل کبھی اکیلے میں“
تو اُس نے دھیرے سے اِک لفظ کہہ دیا ”پاگل“

سب شاعروں نے شعر کہے تیرے عشق میں
غالبؔ سے لے آج کے ناصرؔ بشیر تک

کالک چھُپائی جا نہ سکی جن سے سوچ کی
وہ بھی پہن کے آئے ہیں کپڑے دُھلے ہوئے

وہ پاؤں میں زنجیر مرے ڈال کے ناصرؔ
لو واقفِ آدابِ سفر کرنے لگے ہیں

بس اِک تمہارے ساتھ ہی دھوکہ نہیں کیا
اُس نے کِسی کے ساتھ بھی اچھّا نہیں کیا
تم بار بار اُس کا لیے جا رہے ہو نام
جس نے کبھی بھی ذِکر تمھارا نہیں کیا

اسباب سفر لے کے نکلتے نہیں گھر سے
اس واسطے لُٹنے کا ہمیں ڈر نہیں رہتا

ہم اپنے گھر نہیں لے جا سکے کچھ
ہمیشہ راہ میں لُوٹے گئے ہیں

منظر بدل گئے، پسِ منظر بدل گئے
حالات اپنے شہر کے یکسر بدل گئے

سُورج کے ڈُوبنے پہ نہ حیراں ہوئے کبھی
اب سوچتے ہیں کتنے کیلنڈر بدل گئے

قائم ہے اِک روایتِ دیرینہ ظلم کی
بازو بدل گئے کبھی خنجر بدل گئے

کیا کچھ بنامِ عدل یہاں ہو نہیں رہا
جو فیصلے کیے گئے اکثر بدل گئے

پہلے سے خدّ و خال نہ پہلے سے ہیں خیال
کتنا ہم ایک سال کے اندر بدل گئے

جب میں ناصر بشیر کو دیکھتا ہوں اور پھر جب اس کی غزل پڑھتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے ننّھے منّے دھان پان سے وجود میں فکر و احساس کی اِتنی گٹھڑیاں کیسے سمٹی پڑی ہیں۔ اس سے پہلے مجھے صابر ظفر سے مل کر اسی استعجاب کا سامنا رہا تھا چنانچہ صابر ظفر کی مثال نے میری مشکل آسان کر دی کہ فکر و فن کی قوتوں اور فن کار کے ظاہری مادی وجود کے درمیان کوئی مناسبت قطعی ضروری نہیں۔ ناصر بشیر دراصل قدرت کی اس ودیعت کردہ توانائی سے بہرہ مند ہے جو انسان کے دل و دماغ میں پھول کھلاتی رہتی ہے اور یوں انسانی تہذیب و تمدّن میں اضافوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ شعرا، ناصر بشیر کی عمر میں فن کو صرف ایک موضوع میں محدود رکھ پاتے ہیں مگر ناصر بشیر تو حُسن و عشق کی کار فرمائیوں سے فیض یاب ہونے کے ساتھ ہی اپنے معاشرے، اپنے ماحول، اپنے عہد کے مسائل سے بھی پوری فنّی دیانت کے ساتھ نمٹتا ہے اور اس طرح اس کی غزل خود اس کے باطن کا آئینہ بھی ہے اور اس کے عصر کی نمائندہ بھی ہے۔

احمد ندیم قاسمی